سن اشاعت 2006

قیمت 60

مطبوعہ. ایس کے پرنٹرس دہلی
کتابت : ریاض احمد۔الہ آباد

MINTO KEY NUMAINDA AFSANEY

EDITED BY DR. ATHAR PARVEZ

EDUCATIONAL BOOK HOUSE
MUSLIM UNIVERSITY, MARKET
ALIGARH 202002

ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

کھول دو

امرتسر سے اسپیشل ٹرین دوپہر کے دو بجے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی۔ راستے میں کئی آدمی مارے گئے، متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر ادھر بھٹک گئے۔

صبح دس بجے ـــــ کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں اور بچوں کا متلاطم سمندر دیکھا تو اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہوگئیں اور وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے، اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے ـــــ مگر اس کے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں۔ تیز روشنی اس کے وجود کے سارے ریشوں میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے دماغ پر کئی تصویریں دوڑ گئیں ـــــ لوٹ، آگ، بھاگم بھاگ، اسٹیشن، گولیاں، رات اور سکینہ! سراج الدین اک دم کھڑا ہوگیا اور پاگلوں کی طرح اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ سکینہ سکینہ پکارتا کیمپ کی خاک چھانتا رہا مگر اسے اپنی جوان اکلوتی

بیٹی کا کوئی پتہ نہیں ملا۔ چاروں طرف ایک دھاندلی سی مچی تھی۔ کوئی اپنا بچہ ڈھونڈ رہا تھا کوئی ماں، کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔ سراج الدین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا اور حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی لیکن سوچتے سوچتے اس کا دماغ سکینہ کی ماں کی لاش پر جم جاتا جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس سے آگے وہ اور کچھ نہ سوچ سکتا۔

سکینہ کی ماں مر چکی تھی۔ اس نے سراج الدین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا لیکن سکینہ کہاں تھی جس کے متعلق اس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا "مجھے چھوڑو اور سکینہ کو لے کر جلدی یہاں سے بھاگ جاؤ"۔

سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ اسے اٹھانے کے لیے اس نے رکنا چاہا تھا لیکن سکینہ نے چلا کر کہا تھا "ابا جی چھوڑیئے"۔ لیکن اس نے دوپٹہ اٹھا لیا تھا ـــــ یہ سوچتے سوچتے اس نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی طرف دیکھا اور اس میں ہاتھ ڈال کر ایک کپڑا نکالا۔ سکینہ کا وہی دوپٹہ تھا ـــــ لیکن سکینہ کہاں تھی؟

سراج الدین نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر بہت زور دیا مگر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا کیا وہ سکینہ کو اپنے ساتھ اسٹیشن لے آیا تھا؟ کیا وہ اس کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار تھی؟ راستے میں جب وہ گاڑی رکی ہوئی تھی اور بلوائی اندر گھس آئے تھے تو کیا وہ بے ہوش ہو گیا جو وہ سکینہ کو اٹھا کر لے گئے؟

سراج الدین کے دماغ میں سوال ہی سوال تھے جواب کوئی نہیں تھا۔ اس کو ہمدردی کی ضرورت تھی لیکن چاروں طرف جتنے بھی انسان پھیلے ہوئے تھے سب کو ہمدردی کی ضرورت تھی۔ سراج الدین نے رونا چاہا مگر آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ آنسو نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

چھے روز کے بعد ہوش و حواس کسی طرح درست ہوئے تو سراج الدین ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کو تیار تھے۔ آٹھ نوجوان تھے جن کے پاس لاری تھی، بندوقیں تھیں۔ سراج الدین نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا "گورا رنگ ہے اور بہت ہی خوبصورت۔ مجھ پر نہیں تھی اپنی ماں پر تھی۔ عمر سترہ برس کے قریب ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی بال سیاہ، داہنے گال پر موٹا سا تل ـــــ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ ڈھونڈ لاؤ، خدا تمھارا بھلا کرے گا۔"

رضاکار نوجوانوں نے بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے سراج الدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہوئی تو چند ہی دنوں میں اس کے پاس ہوگی۔

آٹھوں نوجوانوں نے کوشش کی۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ امرت سر گئے۔ کئی عورتوں، کئی مردوں اور کئی بچوں کو نکال نکال کر انھوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا۔ دس روز گذر گئے مگر انھیں سکینہ کہیں نہیں ملی۔

ایک روز وہ اسی خدمت کے لئے لاری پر امرت سر جا رہے تھے کہ چھہرٹے کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی۔ لاری کی آواز سن کر وہ بدکی اور بھاگنا شروع کر دیا۔ رضاکاروں نے موٹر روکی اور سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے۔ ایک کھیت میں انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ دیکھا تو بہت خوبصورت تھی۔ داہنے گال پر موٹا تل تھا۔ ایک لڑکے نے اس سے کہا "گھبراؤ نہیں ـــــ کیا تمھارا نام سکینہ ہے؟" لڑکی کا رنگ اور بھی زرد ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جب تمام لڑکوں نے اسے دم دلاسا دیا تو اس کی وحشت دور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج الدین کی بیٹی سکینہ ہے۔

آٹھ رضاکار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی، اسے کھانا کھلایا، دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا۔ ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دے دیا کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی اور بار بار بانہوں سے اپنے سینے کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔

کئی دن گذر گئے ـــــ سراج الدین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔ وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکر کاٹتا رہا لیکن کہیں بھی اس کی بیٹی کا پتہ نہ چلا۔ رات کو وہ بہت دیر تک ان رضا کار نوجوانوں کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگتا رہتا، جنھوں نے اس کو یقین دلایا تھا کہ اگر سکینہ زندہ ہوئی تو چند دنوں میں وہ اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔

ایک دن سراج الدین نے کیمپ میں ان رضا کار نوجوانوں کو دیکھا۔ لاری میں بیٹھے تھے۔ سراج الدین بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا۔ لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا۔ "بیٹا! میری سکینہ کا پتہ چلا"

سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔ "چل جائے گا۔ چل جائے گا" اور لاری چلا دی۔

سراج الدین نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کی دعا مانگی اور اس کا جی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

شام کے قریب جہاں کیمپ میں سراج الدین بیٹھا تھا اس کے پاس ہی کچھ گڑبڑ ہوئی۔ چار آدمی کچھ اٹھا کر لا رہے تھے۔ اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بیہوش پڑی تھی۔ لوگ اسے اٹھا کر لائے ہیں۔ سراج الدین ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال والوں کے سپرد کر دیا اور چلے گئے۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے لکڑی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔ سراج الدین چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔ سراج الدین نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا اور چلایا "سکینہ!"

ڈاکٹر نے جس نے کمرے میں روشنی کی تھی سراج الدین سے پوچھا "کیا ہے؟"

سراج الدین کے حلق سے صرف اتنا نکل سکا۔ "جی میں ـــــ جی میں اس کا باپ ہوں"

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا اور اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا۔ "کھڑکی کھول دو۔"

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔ بوڑھا سراج الدین خاموشی سے چلایا۔ "زندہ ہے ـــــ میری بیٹی زندہ ہے۔"

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔